شاہد حسین رزاقی

تعلیمی اصلاح و ترقی کے لیے سرسید کا منصوبہ

سرسید کے زمانے میں ہندوستانی مسلمان انتہائی زوال پذیر ہو چکے تھے اور سیاسی، معاشی، دینی، اخلاقی، معاشرتی ہر اعتبار سے ان میں ایسی خرابیاں پیدا ہو گئی تھیں کہ اس ملک میں ان کا قومی وجود تک خطرے میں پڑ گیا تھا۔ اس خطرے کو سرسید نے بڑی شدت سے محسوس کیا اور تمام خرابیاں دور کرنے کے لیے ایک نہایت جامع منصوبہ بنایا جس میں تعلیمی اصلاح و ترقی کو بنیادی اہمیت دی گئی تھی۔ کیونکہ جہالت اور ناقص تعلیم نے قومی ترقی کے راستے میں بے شمار رکاوٹیں پیدا کر دی تھیں اور ان رکاوٹوں کو دُور کیے بغیر سرسید کی اصلاحی کوششوں کا کامیاب ہونا ناممکن تھا۔ مسلمانوں کے قومی زوال کو روکنے اور ان کو راہِ ترقی پر گامزن کرنے کی تدابیر پر عمل کرنا اس لیے بہت مشکل تھا کہ قوم بحیثیتِ مجموعی بالکل جاہل تھی اور جو لوگ تعلیم یافتہ تھے ان کی تعلیم و تربیت اس قدر ناقص اور غلط طریقہ پر ہوئی تھی کہ نہ تو وہ معاشرہ کے لیے مفید بن سکتے تھے اور نہ خود اپنی حالت درست کرنے کی صلاحیت رکھتے تھے۔ بلکہ ناقص تعلیم اور بگڑی ہوئی ذہنیت کی وجہ سے یہ لوگ معاشرہ کے حق میں جہلا سے زیادہ نقصان رساں ثابت ہوئے تھے۔ کیونکہ تعلیم یافتہ طبقہ زیادہ تر مذہبی لوگوں پر مشتمل تھا اور معاشرہ کی اصلاح و ترقی کی تمام کوششوں میں ہمیشہ یہی لوگ سب سے بڑی رکاوٹ بن جاتے تھے۔ سرسید جو اصلاحات کرنا چاہتے تھے ان میں کامیابی کے لیے یہ بات لازمی تھی کہ تعلیم میں اصلاح کی جائے۔ نظامِ تعلیم اور طریقہ تعلیم کو بدلا جائے۔ جدید طرز کے تعلیمی ادارے قائم کیے جائیں جہاں نئے اور مفید علوم سکھائے جائیں۔ اور اچھی تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی تربیت پر بھی پوری توجہ کی جائے۔ تاکہ

تعلیم یافتہ طبقہ ہر اعتبار سے قوم کے لیے مفید ثابت ہو اور ایک ایسے ترقی پذیر معاشرہ کی تعمیر میں اپنا فرض انجام دے سکے جو نئے زمانے کے تقاضوں سے ہم آہنگ ہو۔

تعلیم کا مقصد

تعلیم کی اسی اہمیت اور ضرورت کے پیش نظر سرسید نے قوم کی تعلیم و تربیت پر بہت زیادہ توجہ کی اور قومی تعلیم کے مختلف پہلوؤں سے لوگوں کو باخبر کیا۔ تعلیم انسان میں کس قدر تبدیلی پیدا کر دیتی ہے اور اس کی پوشیدہ صلاحیتوں کو کس طرح نکھارتی ہے اس کو واضح کرنے کے لیے سرسید نے یہ بتلایا کہ انسان کی روح بغیر تعلیم کے چٹکبرے سنگ مرمر کی چٹان کے مانند ہے۔ جب تک سنگ تراش اس میں ہاتھ نہیں لگاتا۔ اس کو خراش تراش کر سڈول نہیں بناتا اور اس کو پالش اور جلا سے آراستہ نہیں کرتا اس وقت تک اس کے جوہر اس میں چھپے رہتے ہیں اور اس کی خوش نمائیں اور دلربا رنگتیں اور خوبصورت بیل بوٹے ظاہر نہیں ہوتے۔ یہی حال انسان کی روح کا ہے۔ انسان کا دل کیسا ہی نیک ہو مگر جب تک اس پر عمدہ تعلیم کا اثر نہیں ہوتا اس وقت تک ہر ایک نیکی اور ہر ایک قسم کے کمال کی خوبیاں جو اس میں چھپی ہوئی ہیں اور جو بغیر اس قسم کی مدد کے نمود نہیں ہو سکتیں ظاہر نہیں ہوتیں۔ بڑے بڑے حکیم اور عالم، ولی و ابدال، نیک و عقل مند، بہادر و نامور ایک گنوار آدمی کی سی صورت میں چھپے ہوئے ہوتے ہیں مگر ان کی یہ تمام خوبیاں عمدہ تعلیم کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہیں۔ وحشی قوموں میں بھی اچھی اچھی باتیں موجود ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی وحشیانہ نیکیاں نہایت ناشائستہ اور نامہذب طور سے ظاہر ہوتی ہیں۔ اگر ان کی مناسب طور سے اور عمدہ تعلیم سے درستی کی جاوے تو وہی وحشیانہ نیکیاں کس قدر ترقی پا سکتی ہیں اور کیسے کیسے عمدہ کام اور مہذب و شائستہ نیکیاں ان سے پیدا ہو سکتی ہیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی جہالت نے ان کی خوبیوں پر کس طرح پانی پھیر دیا ہے اور ان کی خوبیاں نکھارنے کے لیے تعلیم کی ضرورت ہے اس کا اظہار کرنے کے لیے سرسید نے کہا کہ "میں اپنی قوم میں بھی ہزاروں نیکیاں دیکھتا ہوں پر ناشائستہ۔ ان میں نہایت دلیری اور جرأت پاتا ہوں پر خوفناک۔ ان میں نہایت قوی استقلال دیکھتا ہوں پر

بے ڈھنگا۔ ان میں صبر و قناعت بھی ہے پر غیر مفید اور بے موقع۔ پس میرا دل جلتا ہے اور میں خیال کرتا ہوں کہ اگر یہی ان کی عمدہ صفتیں عمدہ تعلیم و تربیت سے آراستہ ہو جاویں تو دین اور دنیا دونوں کے لیے مفید ہوں۔"

تربیت کی اہمیت

انسان کو مہذب اور شائستہ بنانے کے لیے تعلیم کی بڑی اہمیت ہے اور اس کی وجہ سے اس کے پوشیدہ جوہر کھلتے ہیں۔ لیکن صحیح اصول پر تعلیم دینے اور اس سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے سرسید نے تربیت کو بھی اتنی ہی اہمیت دی جتنی کہ تعلیم کو اور وہ تربیت کے بغیر تعلیم کو ناقص سمجھتے تھے۔ چنانچہ انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اچھی تعلیم صرف چند کتابوں کے پڑھ لینے اور طوطے کی طرح یاد کر لینے اور امتحان دیدینے اور انگریزی بول لینے سے حاصل نہیں ہوتی۔ بلکہ اس کے لیے سب سے بڑی تعلیم دینے والی عمدہ سوسائٹی ہے۔ ایک دانش مند کا قول ہے کہ انگلستان میں بچوں اور طالب علموں کو کتاب پڑھنے سے اس قدر تعلیم نہیں ہوتی جس قدر کہ کان اور آنکھ سے ہوتی ہے۔ تربیت تعلیم کا بہت بڑا رکن ہے۔

جب تک تعلیم کے ساتھ تربیت کا بھی خیال نہ ہو اس بات کا امکان نہیں کہ ایک لڑکا انسان بن سکے گا۔ ایسا لڑکا جو چند گھنٹے ماسٹر کے سامنے پڑھ کر آتا ہے، تمام دن خراب صحبت میں بسر کرتا ہے اور اس کو بازاری لونڈوں اور خدمت گاروں کے لڑکوں کی صحبت نصیب رہتی ہے۔ وہ وہی خراب اور بدالفاظ جوان بازاری لڑکوں کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اور وہی نکمی عادتیں جوان لڑکوں میں ہوتی ہیں، سیکھ لیتا ہے۔ انگریزوں کے چھوٹے چھوٹے بچے باوجودیکہ ہمارے بچوں سے علم کی میزان میں کم ہوں مگر جو تربیت اور شائستگی ان میں ہوتی ہے وہ ہمارے بچوں میں نہیں ہوتی۔ جن لوگوں نے ولایت کے لڑکوں اور نوجوانوں کو آکسفورڈ اور کیمبرج میں دیکھا ہے وہ سمجھ سکتی ہیں کہ کیسی تربیت وہاں دی جاتی ہے۔ تربیت انسان کا زیور ہے۔ اور جب تک تعلیم اور تربیت دونوں شامل نہ ہوں اولاد میں انسانیت نہ آسکے گی۔

تعلیم و تربیت کا عجیب حال ہے۔ کسی علم کے پڑھ لینے سے انسان تربیت یافتہ نہیں ہو جاتا جب تک کہ اس کے لیے ایک بہت بڑا گروہ اس کے ہم جنسوں کا جس میں اس کا میل جول ہو تربیت یافتہ موجود نہ ہو۔ ایک یا چند آدمی اپنے خیال کو، اپنے اخلاق کو، اپنی اندرونی نیکی کو، اپنے ذہن کی جودت کو، اپنے خیال کی وسعت کو، اپنی محنت کو، اپنی ہمت کو ترقی نہیں دے سکتے جب تک کہ اسی قسم کے لوگ اس کے میل جول کے لیے نہ ہوں۔ تاکہ باہمی میل جول سے اور سمجھ اور خیالات کے مبادلے سے تمام چیزیں ترقی پائیں۔ لندن کے لوگ تھوڑی سی تعلیم سے بہت زیادہ تربیت پا جاتے ہیں اور ہندوستان کے لوگ جو زمانۂ دراز علم سیکھنے میں صرف کرتے ہیں اور کچھ تربیت نہیں پاتے اس کا سبب یہی ہے کہ وہاں قومی تربیت ہے۔ ہر فرد قوم کا صرف اپنی تربیت یافتہ قوم کے میل جول سے، ان کے خیالات سے، ان میں رہنے سے کچھ نہ کچھ تربیت پا جاتا ہے۔ پس ہماری قوم اگر قومی تعلیم و تربیت کی طرف متوجہ نہ ہوگی تو خود اپنی اولاد کی تربیت کو برباد کرے گی۔

تعلیم اور تربیت کا فرق

ہندوستان میں تعلیم سے پورا فائدہ اٹھانے کے لیے تربیت کی اہمیت کو اس لیے محسوس نہ کیا جاتا تھا کہ یہاں تعلیم کا مفہوم مختلف تھا اور لوگ اس چیز سے ناواقف تھے کہ تعلیم و تربیت میں کیا فرق ہے اور ان دونوں کو بہتر طریقہ پر حاصل کرنا تہذیب و معاشرت کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ سرسید نے تعلیم و تربیت کا فرق ظاہر کرتے ہوئے یہ بتلایا کہ یہ جدا جدا دو چیزیں ہیں۔ جو کچھ کہ انسان میں ہے اس کو باہر نکالنا انسان کو تعلیم دینا ہے۔ اور اس کو کسی کام کے لائق کرنا اس کا تربیت کرنا ہے۔ جو قوتیں کہ خدا تعالیٰ نے انسان میں رکھی ہیں ان کو تحریک دینا اور شگفتہ و شاداب کرنا انسان کی تعلیم ہے۔ اور اس کو کسی بات کا مخزن اور مجمع بنانا اس کی تربیت ہے۔ انسان کو تعلیم دینا درحقیقت کسی چیز کا باہر سے اس میں ڈالنا نہیں ہے بلکہ اس کے دل کے سوتوں کا کھولنا اور اندر کے چشمہ کے پانی کو باہر نکالنا ہے جو صرف اندرونی قویٰ کو حرکت میں لانے اور شگفتہ و شاداب کرنے سے نکلتا ہے۔ اور انسان کو تربیت کرنا اس کے لیے سامان کا مہیا کرنا اور اس سے کام لینا ہے۔

جیسے کہ حوض بنانے کے بعد اس میں پانی کا بھرنا۔ جس طرح کہ تعلیم پانے سے تربیت کا پانا ضروری نہیں، اسی طرح تربیت پانے سے تعلیم کا پانا بھی ضرور نہیں۔ بلکہ تہذیب و ترقی اور شائستگی کے لیے ان دونوں کا پانا ضروری ہے۔

تربیت کا زمانہ

انسان کی تربیت کے لیے سب سے زیادہ موزوں لڑکپن کا زمانہ ہوتا ہے۔ کیونکہ بچے میں ہر قسم کی تربیت کو قبول کرنے کی استعداد قدرتی طور پر موجود ہوتی ہے۔ اس عمر میں اچھی یا بُری جیسی تربیت ہوتی ہے اس کا اثر زندگی بھر قائم رہتا ہے۔ اس لیے سرسید نے تربیت اطفال پر بہت زور دیا۔ اور یہ بتلایا کہ انسان ہی ایسا ذی عقل اور ذی شعور مخلوق ہے جو دنیا کی آئندہ ترقی کو روک سکتا یا ترقی کر سکتا ہے یا اس کو ابتر و خراب حالت میں ڈال سکتا ہے۔ انسان کی اس قوت کا اظہار اس تربیت سے ہوتا ہے جو وہ بچوں کو دیتا ہے۔ بچوں پر تعلیم و تربیت بہت اثر کرتی ہے۔ یا تو اچھی اچھی مثالوں کو دیکھنے سے ان میں عمدہ عمدہ عادتیں اور خصلتیں بیٹھ جاتی ہیں۔ اور یا بُری بُری نظیروں کے دیکھنے سے شروع ہی سے ان میں بد عادتیں اور خراب خصلتیں پڑ جاتی ہیں۔ لڑکپن عمر کا ایسا زمانہ ہے جس میں آئندہ کی بہبودی کے لیے زیادہ تر کوشش ہو سکتی ہے۔ یہ زمانہ ذہنی و عقلی اور اخلاقی تخم ریزی کا ہوتا ہے۔ کیونکہ اس وقت وہ تعلیم و تربیت کو بہت جلد قبول کر لیتا ہے۔ اگر اس زمانہ میں اچھی تربیت نہ ہو تو رفتہ رفتہ عادت میں مضبوطی آجاتی ہے اور اس کا بدلنا نہایت دشوار ہو جاتا ہے۔

جو لوگ کہ قومی تربیت یا قومی ترقی کے خواہاں ہیں ان کا سب سے بڑا کام یہی ہے کہ تربیت اطفال کے لیے عمدہ انتظام کریں۔ مسلمانوں کی حالت خراب ہونے کا ایک بڑا سبب یہی ہے کہ ان میں اطفال کی تربیت کا کوئی عمدہ ذریعہ نہیں ہے۔ مسلمانوں میں اگر کسی کی اولاد عوام الناس کے لونڈوں میں کھیل کود سے بچے اور اپنے ہی ہمجولیوں میں رہے۔ اور اپنے ہمسر خاندان کی صحبت اٹھائے۔ اور دوزانو بیٹھنا اور جھک کر سلام کرنا یا عین کو ٹھیک اس کے مخرج سے نکال کر سلام علیک کہنا اور

ہاتھ جوڑ کر مزاج شریف پوچھنا سیکھ جاوے تو نہایت سعادت مند اور تربیت یافتہ کہا جاتا ہے اور جب اس کے ساتھ اس کو کچھ لکھنا پڑھنا بھی آتا ہو اور کسی میاں جی یا ملا جی سے پڑھتا بھی ہو تو وہ تربیت کے کنگورہ پر پہنچا ہوا سمجھا جاتا ہے۔ مگر صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے بلکہ مفید تربیت کے لیے اور بہت کچھ ہونا چاہیے۔ ایسی تربیت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکوں کے خیالات مثل جانوروں کے خیالات کے محدود ہو جاتے ہیں۔ اور کسی قسم کی ترقی کا مادہ ان میں نہیں رہتا۔ ان کی حرکات محدود بانہ صرف بندر کی سی حرکات ہوتی ہیں۔ تربیت کامل کے لیے جیسا کہ علوم مفیدہ کا پڑھنا شرط ہے ویسا ہی لڑکے کی زندگی کا ایسے طور پر اور ایسی حالت پر بسر ہونا ضروری ہے جس سے روز بروز اس کے خیالات کو وسعت ہوتی جاوے۔ اس کی امنگ بڑھتی جاوے۔ اور اس کے قویٰ شگفتہ و شاداب رہیں۔

تربیت کا صحیح طریقہ

مسلمان لڑکوں کو صحیح تربیت دینے کے بارے میں سرسید کا یہ خیال تھا کہ ان کی عمر دس برس تک نہ پہنچنے پاوے کہ وہ اپنے گھر سے جدا رکھے جاویں اور ان کی خاص طور پر اور خاص نگرانی میں تعلیم ہو۔ کسی شہر کے قریب جس کی آب و ہوا عمدہ ہو پُر فضا جگہ پر مکانات تعمیر کیے جاویں اور پھول باغ لگایا جاوے۔ عمارتوں کے ساتھ مسجد بھی بنائی جاوے۔ اور ایک کتب خانہ بھی بنایا جاوے۔ ایک بڑا کمرہ کھانا کھانے کے لیے ہو اور ایک ایسے کھیلوں کے لیے ہو جو مکان کے اندر کھیلے جاتے ہیں۔ اور ہر ایک لڑکے کو ایک مناسب کمرہ بیٹھنے اور پڑھنے کو ملے۔ کسی لڑکے کے ساتھ کوئی خدمت گار نہ ہو بلکہ ان مکانات کے متعلق نوکر ہوں اور سب کام وہی کیا کریں۔ لڑکوں کے لیے ضروری ہو کہ مسجد میں باجماعت نماز پڑھیں۔ صبح کی نماز کے بعد تجویز کردہ طریقہ کے مطابق قرآن مجید پڑھا کریں۔ سب کو ایک قسم کا یکساں لباس پہنایا جاوے۔ اور سب مل کر وقتِ معینہ پر کھانا کھاویں۔ پڑھنے کھیلنے اور ورزشِ جسمانی کے اوقات مقرر ہوں اور ہر ایک کے لیے ان کی پابندی لازمی ہو۔ ان مکانات پر نہایت لائق اور معتمد شخص بطور اتالیق کے مقرر ہو۔ وہ تمام نگرانی اور سب

طرح کا بندوبست کرتا رہے۔ اور لڑکوں کی صحت و تندرستی کا نگراں رہے۔ اور اس بات کی بھی نگرانی کرے کہ تمام لڑکے اوقاتِ مقررہ میں وہی کام کریں جو اس وقت کے لیے معین ہو۔ لڑکوں کے آرام اور ان کے اپنے گھر جانے اور عزیز و اقارب یا لڑکوں سے ملنے ملانے کے قواعد مقرر ہوں اور ہمیشہ ان قواعد کی پابندی کی جائے۔ لڑکوں کا علاج کرنے کے لیے بھی ایک طبیب ملازم رہے۔ یہ مکانات عالی شان بنائے جاویں اور جو ماہانہ اخراجات ہوں وہ داخل ہونے والے لڑکوں کے مربیوں سے لیے جاویں۔ جب تک کہ لڑکے گھروں سے علاحدہ ہو کر اس طرح پر تربیت نہ پاویں گے وہ خراب اور بُری عادتوں کے عادی رہیں گے۔ تربیت گاہ کے اس خاکے کا اہم حصہ یہ بھی ہے کہ اس سے متصل مدرسہ ہو جس میں نئے اور مفید علوم و فنون کی تعلیم دی جائے اور صحیح طور سے دینی تعلیم دینے کا بھی معقول انتظام ہو۔ تعلیم و تربیت کے لیے ادارہ کا یہ وہ نقشہ ہے جو سرسید نے انگلستان کے تعلیمی اداروں کو دیکھنے کے بعد مرتب کیا تھا اور اسی کے مطابق انھوں نے مدرسۃ العلوم قائم کیا۔

انگریزی حکومت نے ہندوستان میں بھی جدید قسم کی اعلیٰ تعلیم دینے کا انتظام کیا تھا، اور ہندو اس سے فائدہ اٹھا کر اپنی معاشرتی اور اقتصادی حالت کو بہتر بنا رہے تھے۔ لیکن اس تعلیم میں کئی نقائص تھے جن میں سب سے بڑا نقص تربیت کا فقدان تھا۔ اس لیے سرسید یہ چاہتے تھے کہ ہندوستان میں جو اعلیٰ تعلیم دی جاتی ہے اس کے نقائص دور کیے جائیں تاکہ ہندوستانی معاشرہ ان خصوصیات سے مستفید ہو سکے جو یورپی ممالک میں جدید تعلیم کی بدولت پیدا ہو جاتی ہیں۔ ہندوستان میں دی جانے والی تعلیم کے نقائص ظاہر کرتے ہوئے سرسید نے یہ بتلایا کہ یہاں جو اعلیٰ تعلیم کہلائی جاتی ہے وہ درحقیقت اعلیٰ درجہ کی تعلیم نہیں ہے بلکہ صرف ایک ادنیٰ درجہ کی تعلیم ہوتی ہے۔ یہ تعلیم جو انگریزی زبان کے ذریعہ سے ہندوستان میں ہوتی ہے اس کے لیے کوئی ایسا سامان نہیں ہے کہ جو شخص کسی علم کی کسی شاخ میں اعلیٰ درجہ کی تعلیم پانا چاہے تو اعلیٰ درجہ کی تعلیم پا کر اس فن کا ماسٹر ہو سکے۔ ہندوستان میں اعلیٰ تعلیم دینے والی دو یونیورسٹیاں

موجود ہیں وہ بلاشبہ بی۔ اے اور ایم۔ اے کی ڈگریاں دیتی ہیں مگر اس تعلیم کو اعلیٰ تعلیم کہنا ہمارے نزدیک محض ناواجب ہے۔ بلکہ وہ علم کی بعض شاخوں میں اوسط درجہ کی تعلیم ہے اور بعض شاخوں میں ادنیٰ درجہ کی تعلیم کا رتبہ رکھتی ہے۔ یونیورسٹیوں کے ماتحت کالجوں میں جو تعلیم دی جاتی ہے وہ زیادہ تر کتابی اور دماغی تعلیم سے متعلق ہے۔ مگر اعلیٰ اور اخلاقی تعلیم صرف کتابوں کی تعلیم سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ عمدہ سوسائٹی اس کی تعلیم دیتی ہے۔ بڑی ضرورت ہندوستان میں اعلیٰ درجہ کی دماغی تعلیم کی اور اخلاقی اور معاشرتی حالت کی درستی کی ہے جو ابھی تک نہیں ہوئی۔

تعلیم اور عملی زندگی

انسان کی تعلیم و تربیت کا ایک بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ وہ زندگی میں کامیاب رہے۔ اور اس کے لیے سرسید کے خیال میں یہ بہت ضروری ہے کہ انسان اس بات کا فیصلہ کرے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ جب انسان بچپن کی حالت میں ہوتا ہے اور اس امر عظیم کا خود فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہوتا تو اس کے مربیوں کا یہ فرض ہوتا ہے کہ وہ خود اس کے لیے اس بات کا فیصلہ کریں اور جب وہ انسان خود اس امر کے فیصلے کے لائق ہو تو اس کو اختیار ہو گا کہ خواہ اس فیصلے کو بحال رکھے اور چاہے منسوخ کر کے خود اس کا فیصلہ کرے۔ تمام مہذب ملکوں میں ایک عام رواج ہے کہ جب بچہ تعلیم پانے کی عمر کو پہنچتا ہے تو اس کے مربی اس امر کا فیصلہ کرتے ہیں اور اس فیصلے کے مطابق اس کی تعلیم و تربیت کا بندوبست کرتے ہیں۔ ایک طالب علم جو ابتدائی تعلیم شروع کرتا ہے جب تک وہ اس کا فیصلہ نہ کرے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا اس وقت تک اس کو تعلیم میں کبھی کامیابی نہیں ہوتی۔ بہت سے طالب علموں کو ہم دیکھتے ہیں کہ کسی قسم کی تعلیم شروع کرتے ہیں اور پھر اس سے گھبرا کر چھوڑ دیتے ہیں۔ اس کا سبب درحقیقت یہی ہوتا ہے کہ انھوں نے اس بات کہ وہ کیا ہوں گے اور کیا کریں گے بخوبی فیصلہ نہیں کیا اور اسی سبب ان میں عزم جزم پیدا نہیں ہوا جو تمام مشکلات کا آسان کرنے والا اور ہر ایک موانع پر غالب

آنے والا ہے۔

زمانۂ طالب علمی کے بعد انسان کی زندگی میں ایک ایسا زمانہ آتا ہے جس میں اس امر کا تصفیہ زیادہ تر عظیم الشان ہو جاتا ہے۔ جب وہ اپنی ضروری تعلیم و تربیت سے فارغ ہوتا ہے اور ایک قسم کی تمیز اور سمجھ حاصل کرتا ہے تب اس کو خود اپنے آپ سے پوچھنا ہوتا ہے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔ اور اس وقت اگر وہ اس کے تصفیہ پر قادر نہیں ہوتا تو ہمیشہ خراب و خستہ رہتا ہے۔ اور اگر بخوبی تصفیہ کر لیتا ہے اور تصفیے میں غلطی بھی نہیں کرتا تو اس میں عزم جزم پیدا ہوتا ہے اور وہ اس میں ضرور کامیابی حاصل کرتا ہے۔ چنانچہ سرسید نے زندگی کو کامیاب بنانے اور صحیح تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے لیے یہ بہت ضروری قرار دیا کہ انسان یہ فیصلہ کرلے کہ اس کو کیا بننا اور کیا کرنا ہے۔ یہ فیصلہ کرنے میں حقائق کو ملحوظ رکھا جائے تاکہ فیصلہ غلط نہ ہو اور اس فیصلے کے مطابق پورے عزم کے ساتھ جدوجہد کی جائے تاکہ حصولِ مقصد میں کامیابی ہو۔ کیونکہ کامیابی کی جڑ اس امر کا صحیح فیصلہ کر لینا ہے کہ میں کیا ہوں گا اور کیا کروں گا۔

مذہبی تعلیم کی ضرورت

یورپ میں جدید تعلیم کے حامیوں کا ایک گروہ ایسا تھا جو مذہبی تعلیم کو عام تعلیم سے خارج کر دینا چاہتا تھا کیونکہ وہ لوگ اس تعلیم کو باہمی اختلاف کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اور اس قسم کی عام تعلیم دینا چاہتے تھے جو بلا اختلاف سچ اور فائدہ مند ہو۔ ان لوگوں کے برعکس دوسرا گروہ مذہبی تعلیم کو اصل مقصد قرار دے کر عام تعلیم کو ضمنی حیثیت دینا چاہتا تھا۔ سرسید کو پہلے گروہ سے اختلاف تھا۔ اس لیے کہ مذہبی خیالات کو تمام انسانوں کے دلوں سے نکال ڈالنا جن کی تعلیم میں کوشش مقصود ہے ایک ایسا امر ہے جس کے ہونے کی سیکڑوں برس تک توقع نہیں ہے۔ اس لیے اس گروہ کو کامیابی نہیں ہوئی۔ لیکن دوسرے گروہ نے نہایت کامیابی حاصل کی۔ اور اس کے سبب سے بے انتہا علوم و فنون نے ترقی پائی۔ اور ان لوگوں نے نہ صرف اپنی قوم اور ملک کو فائدہ پہنچایا بلکہ دور دور کی قوموں اور دور دور کے ملکوں کو بھی ہر قسم کی خوبیوں اور فائدوں سے اپنا احسان مند بنایا۔ اور

آئندہ نسلوں کی تعلیم کے لیے کروڑوں روپیہ جمع کر جانے۔ اور کتب خانوں اور مدرسوں اور کالجوں کے بنانے اور یونیورسٹیوں کے قائم کر جانے سے تمام علوم و فنون کا دروازہ کھولا۔ اس طریقے کی کوششوں میں جو نقصان تھا وہ صرف یہ کہ بد تعصباتِ مذہبی کی ترقی کا اندیشہ تھا۔ مگر اچھی تعلیم نے خود اس نقص کو مٹا دیا۔ بلکہ ضرورتِ تمدن و معاشرت کے سبب سے تعصبات بہت گھٹ گئے اور بہت سی متعصبانہ رسمیں دور ہو گئیں۔ ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے لیے سرسید کے خیال میں یہ ضروری تھا کہ ان کو جدید علوم و فنون کی مفید تعلیم کے ساتھ ساتھ مذہبی تعلیم بھی دی جائے۔ لیکن مذہبی تعلیم سے ان کا مقصد یہ نہ تھا کہ "دو چار ملاّں کسی جگہ پڑھانے کو مقرر کر دیے جاویں اور وہی پرانی کڑھائی کتابیں دو چار دس پانچ آدمیوں کو پڑھانے لگیں۔ بلکہ سب سے بڑی ضرورت اس بات کی ہے کہ اول فہمیدہ فہمیدہ، ذی علم و ذی عقل لوگ جمع ہوں اور بعد بحث و گفتگو کے یہ بات قرار دیں کہ اب سلسلۂ تعلیم بہ نظر حالاتِ زمانہ اور بہ لحاظ علوم و فنونِ جدید کے کس طرح پر قائم ہونا چاہیے اور ہماری پرانی اور دقیانوسی تعلیم کے سلسلہ میں کیا کیا تبدیل اور ترمیم کرنی چاہیے اور ہمارا سلسلہ تعلیم کا بہ لحاظ مقاصد مذہبی کس طرح پر قائم ہو"۔

ہندوستان میں لوگ مذہبی تعلیم کے تو بڑے حامی تھے لیکن یہ چاہتے تھے کہ ان کی مذہبی تعلیم کا بندوبست بھی حکومت کرے۔ سرسید کا یہ خیال تھا کہ تعلیم کا پورا بوجھ صرف حکومت پر ڈالنا اور خود کچھ نہ کرنا بڑی بے حسی اور بے غیرتی کی بات ہے۔ اور ایسے ملک میں جہاں پچیس کروڑ آدمی بستے ہوں حکومت نہ تو پوری آبادی کو تعلیم دے سکتی ہے اور نہ ایسی پوری تعلیم کا انتظام کر سکتی ہے جس سے ہمارے پورے اغراض حاصل ہو سکیں۔ سرسید کی یہ رائے تھی کہ اہل ہند اپنی مذہبی تعلیم کا انتظام خود کریں۔ چنانچہ امرتسر میں تقریر کرتے ہوئے انھوں نے یہ خیال ظاہر کیا کہ گورنمنٹ ہر فرقہ کی مذہبی تعلیم کے قصے میں نہیں پڑ سکتی۔ وہ عام تعلیم کی پالیسی اختیار کرے گی مسلمان مذہبی تعلیم دینا لازمی تصور کرتے ہیں اور ان کا فرض ہے کہ وہ خود مذہبی تعلیم کا انتظام کریں۔ جب تک تمھارے جسم میں جان ہے تم مذہبی تعلیم کو ہرگز نہ چھوڑو۔ گورنمنٹ ہماری مدد کر سکتی ہے لیکن ہماری یہ

غرض خود متوجہ ہوئے بغیر پوری نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہم اپنے بچوں کی تعلیم اپنے ہاتھ میں نہ لیں ہم ان کو دونوں طرح کی تعلیم نہیں دلا سکتے۔

پرانے علوم کی حالت

مسلمانوں کی تعلیم میں سب سے بڑا نقص یہ تھا کہ وہ صرف پرانے علوم تک محدود تھی اور جدید علوم و فنون کا اس میں کوئی دخل نہ تھا۔ یہ مروجہ علوم اس قدر پرانے تھے کہ صدیوں سے غیر مفید ہو گئے تھے۔ اور ان کو ایجاد کرنے والے نئے علوم سے جو موجودہ زمانے کے لیے نہایت ضروری اور مفید ہیں واقف تک نہ تھے۔ مسلمانوں نے پرانے علوم جس زمانے میں اختیار کیے تھے اس وقت کے لیے وہ یقیناً مفید تھے اور ان سے نہ صرف مسلمانوں بلکہ یورپ کی قوموں کو بھی بہت فائدہ پہنچا لیکن ان علوم میں چونکہ زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے ساتھ ساتھ کوئی تبدیلی نہیں ہوئی اس لیے یہ رفتہ رفتہ ناقص اور غیر مفید ہو گئے۔ لیکن مسلمان بدستور انہی علوم کو حاصل کرتے رہے اور ان کو اپنے اسلاف کا بڑا کارنامہ سمجھ کر ان سے سرمو انحراف کرنے پر تیار نہ ہوئے۔ سرسید نے مسلمانوں کو یہ بتلایا کہ موجودہ زمانے کے لیے پرانے علوم کافی نہیں ہیں اور نئے علوم حاصل کرنے کی ضرورت ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک زمانہ تھا کہ ہمارے باپ دادا اپنے حاصل کیے ہوئے علوم پر فخر کرتے تھے اور وہ فخر بے شک ہمیشہ رہے گا۔ اور ان لوگوں کے نام عزت سے لیے جائیں گے مگر اس زمانے میں یہ چیز قابل دیکھنے کے ہے کہ کون سی چیز اب ہم کو اور ہمارے ملک کو مفید ہے۔ جس زمانے میں مشرقی علوم ہمارے باپ دادا نے حاصل کیے تھے اس کو ہزاروں برس ہو گئے۔ جو علوم سابق میں جاری اور ایجاد ہوئے تھے ان میں بعض علوم تو بلاشبہ اب تک سچے ثابت ہوئے ہیں مگر ان میں بھی بہت کچھ ترقی ہو گئی ہے۔ اور بہت سے علوم اب ایسے ایجاد ہوئے ہیں جن کو ہمارے تمھارے باپ دادا نہ جانتے تھے، اور وہ اس زمانے کے لیے مفید اور کارآمد ہیں۔ اگر ہم اس پرانی لکیر کو پیٹتے رہیں تو گویا ہم موجودہ زمانے سے سیکڑوں برس پیچھے ہٹتے ہیں۔ حالانکہ ہم کو آگے بڑھنا چاہیے۔

مسلمانوں نے اپنے دورِ عروج میں صدیوں تک علوم وفنون کی ترقی میں بہت اہم اور نمایاں حصہ لیا اور دنیا کی مختلف قوموں نے ان کے تعلیمی اداروں سے فائدہ اٹھایا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی خصوصیت یہ تھی کہ وہ علم کو مسلسل ترقی دے رہے تھے اور اس بنا پر دنیا کی دوسری تمام قوموں سے زیادہ ممتاز تھے۔ لیکن جب ان کی علمی ترقیوں کا یہ سلسلہ ختم ہو گیا تو وہ پرانی لکیر کے فقیر بن گئے اور علمی دنیا میں ان کی حالت بہت پست ہو گئی۔ اب اس پستی سے نکلنے کی صورت صرف یہی ہے کہ مسلمان جدید علوم کو حاصل کریں۔ اور دنیا کی علمی ترقی میں حصہ لینے کے قابل بنیں۔ مسلمانوں نے علمی ترقی کے مختلف مدارج کیوں کر طے کیے اور علوم کی نوعیت میں کس طرح تبدیلی ہوئی اس کو واضح کرنے کے لیے سرسید نے یہ بتلایا کہ مسلمانوں میں ترقی علوم کا آغاز قرآن مجید کو اول سے آخر تک یکجا جمع کر کے بطور ایک کتاب کے لکھنے سے ہوا۔ دوسری منزل ترقی علوم کی یہ تھی کہ لوگ حدیثوں کو جمع کرنے اور حدیثوں کی کتابیں لکھنے پر مجبور ہوئے۔ اس کے بعد علمِ کلام میں کتابیں تصنیف ہونی شروع ہوئیں اور اس کی ترقی سے مسلمانوں میں علوم کو ترقی ہوئی۔ خلفائے عباسیہ کے عہد میں یونانی علوم کے عربی زبان میں ترجمے ہوئے اور یہ مسلمانوں میں رائج ہو گئے جس سے علوم کی ترقی کا ایک نیا دور شروع ہوا۔ یہ سب دور گذر گئے اور اب علوم کی ترقی کے لیے اس بات کی ضرورت ہے کہ جس طرح قدیم یونانی فلسفہ اور حکمت ہم مسلمانوں نے حاصل کی تھی اب ہم فلسفہ وحکمتِ جدیدہ حاصل کرنے میں ترقی کریں۔ کیونکہ علومِ یونانیہ کی غلطی اب علانیہ ظاہر ہو گئی ہے اور علومِ جدیدہ نہایت عمدہ اور مستحکم بنیاد پر قائم ہوئے ہیں۔

ایک زمانے میں مسلمانوں نے علوم اور فنون میں ایسی ترقی کی تھی اور ایسی فیاضی سے اپنے علوم سے یورپ کی قوموں کو نفع پہنچایا کہ بڑے بڑے مصنفوں نے اس بات کا اقرار کر لیا ہے کہ اگر مسلمان ان علوم میں ایسی ترقی نہ کرتے اور ان سے اور قوموں کو ایسا فائدہ نہ پہنچاتا جیسا پہنچا تو آج دنیا میں ان علوم وفنون کا نام بھی نہ ہوتا۔ قرطبہ کی یونیورسٹی نے اور بغداد کی یونیورسٹی نے اپنے علوم و فنون کی ترقی کی وجہ سے تمام دنیا میں علم کا آفتاب روشن کر دیا۔ مسلمانوں کی علمی ترقی کے اس زمانہ

ہیں ان کی تعلیم بھی عمدہ تھی اور ان میں سب خوبیاں بھی موجود تھیں لیکن جب ان میں علوم کی ترقی بند ہوگئی تو ان کی تعلیم بھی ناقص ہوگئی اور ان کی تمام خوبیاں بھی جاتی رہیں۔ علمی اور معاشری پستی کی اس حالت سے نکلنے کے لیے سرسید اس بات کو لازمی سمجھتے تھے کہ مسلمان جدید اور مفید علوم و فنون کو حاصل کریں اور علمی ترقی کے اس راستے پر پھر چلنے لگیں جو انھوں نے صدیوں سے ترک کر دیا ہے۔

انگریزی کی تعلیم

سرسید کے زمانے میں نہ صرف تعلیمی ترقی بلکہ سیاسی معاشرتی اور اقتصادی اعتبار سے بھی انگریزی کی تعلیم حاصل کرنے کی بڑی ضرورت تھی۔ ہندوؤں نے اس ضرورت کو محسوس کر لیا تھا اور انگریزی تعلیم حاصل کر کے اس سے فائدہ اٹھا رہے تھے۔ لیکن مسلمان انگریزی سے متنفر تھے اور ان کی یہ نفرت بھی ان کی ترقی کے راستے میں ایک رکاوٹ بن گئی تھی۔ سرسید چاہتے تھے کہ مسلمان انگریزی زبان سیکھنے اور اس کی تعلیم حاصل کرنے پر توجہ کریں اور اس کی ترغیب دلانے کے لیے انھوں نے یہ استدلال پیش کیا کہ جس زمانے میں جس قوم کی حکومت ہوتی ہے اس زمانے میں اسی کی زبان اختیار کی جاتی ہے۔ اور جس ملک میں جو زبان حکومت کرتی ہے اس ملک میں اسی زبان کا عروج ہوتا ہے اور لوگ اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ خلفائے بنوامیہ اور بنوعباس کے زمانہ میں عربی زبان کا عروج تھا اور ہر شخص اس زبان کو سیکھنا چاہتا تھا ہندوؤں کے زمانے میں ہندوستان میں سنسکرت کا عروج تھا اور اسی کو لوگ اختیار کرتے تھے۔ اور جب مسلمانوں کی عملداری ہندوستان میں ہوئی تو فارسی زبان کا عروج ہوا اور سب نے فارسی زبان میں تعلیم پانا اختیار کیا۔ اب ہندوستان میں انگریز کی حکومت ہے جس کی زبان انگریزی ہے اور اسی زبان کو عروج ہے۔ اس لیے ہر شخص اس زبان کے اختیار کرنے پر مائل ہے لیکن مسلمانوں نے انگریزی زبان کے حاصل کرنے میں بہت کوتاہی کی ہے جو بڑی غلطی ہے۔

انگریزی زبان سے مسلمانوں کی نفرت کا سبب یہ بھی تھا کہ ان کا بڑا طبقہ انگریزی پڑھنے کو

اسلام کے خلاف سمجھتا تھا۔ سرسید نے اس خیال کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ بہت سے بزرگ انگریزی خواں لوگوں کو بدعقیدہ یا ملحد و دہریہ کہتے ہیں۔ شاید ایسا کوئی ہو جس سے میں واقف نہیں ہوں۔ مگر ایسے لوگوں سے واقف ہوں جو ایک حرف انگریزی کا نہیں جانتے مگر بدعقیدہ ہیں۔ بعض علماء مسلمانوں کو نصیحت کرتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے والوں کو آگے جانے دو۔ اگر تم دینی تمدنی ترقی چاہتے ہو تو ہٹو اور پچھلے لوگوں سے جاملو۔ اور یہاں تک پیچھے ہٹو کہ ہٹتے ہٹتے صحابہ اور نبی آخرالزمان سے جاملو۔ پیچھے ہٹنا تو آسان ہے۔ مگر صحابہ اور رسول خدا صلعم تک جا ملنا نہایت دشوار بلکہ ناممکن ہے۔ مجھ کو خوف ہے کہ ایسا نہ ہو کہ پیچھے ہٹتے ہٹتے گڑھے میں جا پڑو۔ تاریخ اسلام کی ورق گردانی کرو اور دیکھو کہ جب کبھی مسلمانوں نے علوم مذہبی کے ساتھ علوم دنیوی میں ترقی کی اور دنیا میں دولت و عزت اور شان و شوکت حاصل کی وہی زمانہ اسلام کی ترقی اور جاہ و جلال اور عزت و شوکت کا سمجھا جاتا ہے۔ جو علماء کہتے ہیں کہ انگریزی پڑھنے اور علوم جدیدہ میں ترقی کرنے سے مسلمانوں کے ایمان میں خلل آتا ہے ان کو یہ جاننا چاہیے کہ اسلام میں اور دنیوی عزت حاصل کرنے میں کوئی تناقض نہیں ہے۔ یورپ میں جدید تعلیم نے عیسائیت پر جو برا اثر ڈالا تھا اس سے سرسید بخوبی واقف تھے۔ لیکن اسلام کو نئے علوم سے ایسا کوئی خطرہ نہ تھا۔ چنانچہ وہ مسلمانوں کے لیے جدید علوم اور انگریزی کی تعلیم کے ساتھ ساتھ دینی تعلیم کو بھی لازمی تصور کرتے تھے۔

انگریزی زبان میں تعلیم دینے کے بارے میں سرسید کا یہ خیال تھا کہ جن اسکولوں کا مقصد طلباء کو اعلیٰ تعلیم کے لیے تیار کرنا نہیں ہے وہاں مغربی علوم کو دیسی زبان میں پڑھانا ملک کے حق میں بہتر ہوگا۔ لیکن جو اسکول اس لیے قائم کیے گئے ہیں کہ اعلیٰ تعلیم کے لیے بطور ایک زینہ کے کام دیں وہاں یورپی علوم کو دیسی زبان میں پڑھانا مفید نہیں ہو سکتا۔ ہندوستان میں انگریزی زبان کی حکومت ہے۔ اس لیے اس ملک میں دیسی زبان کے ذریعہ سے اعلیٰ تعلیم کو ترقی نہیں ہو سکتی۔ سرسید کا یہی وہ نظریہ تھا جس کی وجہ سے انھوں نے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال ترک کر دیا تھا۔ وہ اردو میں اعلیٰ تعلیم دینے اور یونیورسٹی قائم کرنے کے بڑے حامی تھے اور اس کے لیے بہت کوشش کی۔

لیکن جب ان کو یہ معلوم ہوا کہ حکومت کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر کے اس کی جگہ اردو یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے تو وہ اپنی کوششوں سے دست کش ہو گئے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ اس طرح ملک انگریزی تعلیم سے محروم ہو جائے گا۔ اور یہ محرومی اعلیٰ تعلیم اور علمی ترقی کے لیے نقصان رساں ہوگی۔

دیسی زبان میں تعلیم کی اہمیت

سرسید کے زمانے میں ہندوستان کی کوئی زبان اس قابل نہ تھی کہ اس کو یورپی علوم و فنون کی تعلیم کا ذریعہ بنایا جا سکتا۔ اس وقت علمی ترقی کے لیے مقامی زبانوں کو اعلیٰ تعلیم کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس بات کی ضرورت تھی کہ جدید علوم کو ان زبانوں میں منتقل کیا جائے۔ اور اس ضرورت کو محسوس کر کے سرسید نے سائنٹفک سوسائٹی قائم کی تھی جس کا مقصد اردو میں نئے علوم و فنون کی کتابوں کا ترجمہ کرنا تھا۔ ہندوستان کے مخصوص حالات کی وجہ سے سرسید انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنائے رکھنے کے اس قدر حامی تھے ورنہ وہ اس بات کو خوب محسوس کرتے تھے کہ جو قوم خود اپنی زبان میں تعلیم حاصل کرتی ہے وہ بہت تیزی سے ترقی کر جاتی ہے۔ اور انگلستان میں قیام کے زمانے میں انھوں نے جو کچھ دیکھا اس سے اس خیال کی پوری تصدیق بھی ہو گئی چنانچہ انھوں نے اپنی یہ رائے ظاہر کی کہ انگریز قوم نے جو اس قدر ترقی کی ہے وہ صرف اس بات کا نتیجہ ہے کہ تمام علوم و فنون اسی زبان میں ہیں جو وہ لوگ بولتے ہیں۔ اگر انگریزی زبان میں تمام علوم و فنون نہ ہوتے بلکہ لیٹن میں یا گریک میں یا فارسی، عربی میں ہوتے تو تمام انگریز اب تک ایسے ہی جاہل اور بے علم اور لاکھوں ناخواندہ ہوتے جیسے کہ بدنصیبی سے ہم لوگ ہندوستان میں جاہل ہیں۔ اور آئندہ کو بھی جب تک کہ تمام علوم و فنون ہماری زبان میں نہ ہوں گے ہم جاہل اور نالائق رہیں گے اور کبھی عام تربیت نہ ہوگی۔ انگلستان کے عوام میں سرسید نے جو عام تعلیم، تہذیب و شائستگی اور عمدہ تربیت دیکھی اس سے وہ بے انتہا متاثر ہوئے۔ اور اس کے اسباب واضح کرتے ہوئے انھوں نے یہ بیان کیا کہ گو انگلستان میں بعض مقاموں کی زبانیں ایسی گنواری ہیں جن پر انگریزی کا اطلاق کرنا مشکل ہے مگر انگریزی زبان انگلستان میں ایسی ہے جیسی ہندوستان میں

علی الخصوص شمالی و مغربی اضلاع اور صوبۂ بہار میں اردو جس کو ہر کوئی سمجھتا ہے۔ اور انگلستان میں تمام ترقی کا باعث صرف یہ ہے کہ تمام چیزیں، تمام علوم، تمام فن جو کچھ ہے قوم کی اسی زبان میں ہے جو عموماً یا قریب قریب عموماً کے بولی جاتی ہے۔ پس جو لوگ حقیقت میں ہندوستان کی بھلائی اور ترقی چاہنے والے ہیں وہ یقین جان لیں کہ ہندوستان کی بھلائی صرف اسی پر منحصر ہے کہ تمام علوم اعلیٰ سے لے کر ادنیٰ تک انھیں کی زبان میں ان کو دیے جائیں۔ میری یہ رائے ہندوستان کے ہمالیہ پہاڑ کی چوٹی پر نہایت بڑے بڑے حرفوں میں آئندہ زمانے کی یادگاری کے لیے کھود دیے جاویں کہ اگر تمام علوم ہندوستان کو اسی کی زبان میں نہ دیے جائیں گے تو کبھی ہندوستان کو شائستگی و تربیت کا درجہ نصیب نہیں ہوگا۔

مسلمانوں کے لیے تعلیم کیسی ہو

مسلمانوں کو کس طریقہ پر تعلیم دی جائے یہ اس وقت بہت اہم اور غور طلب مسئلہ تھا اور اس پر مختلف رائیں تھیں۔ چنانچہ ایک کمیٹی اس غرض سے مقرر کی گئی تھی کہ وہ غور و فکر اور باہمی مباحثہ کے بعد یہ رپورٹ تیار کرے کہ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے کون سا طریقہ اچھا ہوگا اور موجودہ حالات میں اس مقصد کے لیے کون سی تدبیریں اختیار کی جائیں۔ اس کمیٹی کے ممبروں کے سامنے سرسید نے جو بیان دیا اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ مسلمانوں کے لیے کس طریقۂ تعلیم کو مفید اور اچھا سمجھتے تھے اور ان کی تعلیم میں مختلف طبقوں کے کن کن مقاصد کو ملحوظ رکھنا ضروری تھا۔ اس ضمن میں سرسید نے اپنا یہ خیال ظاہر کیا کہ تعلیم ہمیشہ کسی ایک خاص مقصد کے لیے نہیں ہوتی اور نہ کسی ایک گروہِ کثیر کا ہمیشہ ایک ہی مقصد ہوتا ہے۔ بلکہ ایک گروہِ کثیر میں سے مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں۔ ہم جس طریقۂ تعلیم کے قرار دینے کی فکر میں ہیں وہ ایک بہت بڑے گروہ سے علاقہ رکھتا ہے۔ اور یقینی مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد ہوتے ہیں۔ پس ہم کو ایسا طریقۂ تعلیم تجویز کرنا چاہیے جو مختلف جماعتوں کے مختلف مقاصد کے پورا کرنے کو کافی ہو۔ ہم مسلمانوں میں ایک جماعت ایسی ہے جو گورنمنٹ کے اعلیٰ اعلیٰ عہدوں کے حاصل

کرنے اور انتظامِ گورنمنٹ میں شامل ہوکر دنیاوی عزت حاصل کرنے اور اپنے ملک کو فائدہ پہنچانے کی آرزو رکھتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو گورنمنٹ کے عہدوں کے حاصل کرنے کا کچھ خیال نہیں ہے بلکہ وہ اپنی قوتِ بازو سے بذریعۂ تجارت یا اجرائے کارخانہ جات کے اپنی معاش پیدا کرنے کی خواہش مند ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ وہ صرف اپنی جائداد اور اپنے علاقہ جات کی درستی کی آرزو رکھتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ علوم و فنون کو حاصل کرنا اور ان میں واقفیتِ کامل حاصل کرنا پسند کرتی ہے۔ ایک جماعت ایسی ہے کہ اس کو ان تمام چیزوں سے چنداں تعلق نہیں ہے بلکہ وہ بہ لحاظ اپنی معاد کے علومِ دین میں دستگاہِ کامل حاصل کرنا اور اسی میں اپنی زندگی بسر کرنا چاہتی ہے۔ اور ایک جماعت عوام الناس کی ہے جن کے لیے کسی قدر عام تعلیم کا ہونا ضروری ہے۔ بایں ہمہ ہر ایک کو اپنی اولاد کی نسبت یہ خواہش ہے کہ اس کے عقائد مذہبی بھی درست رہیں اور وہ ادائے فرائض مذہبی سے بھی غافل نہ ہو جاوے پس جب کہ ہم تمام مسلمانوں کی تعلیم کا طریقہ قرار دیتے ہیں تو ہم کو ایسی تجویز کرنی چاہیے جس سے تمام مقاصد مذکورہ اور نیز دیگر مقاصد جو تعلیم سے متعلق ہیں حاصل ہوں۔

سرسید کی رائے یہ تھی کہ مسلمان اپنے تعلیمی مقاصد اسی وقت حاصل کرسکیں گے جب وہ حکومت پر انحصار کرنے کے بجائے خود اس کے لیے کوشش کریں گے اور اپنے مقاصد کے حصول تک حکومت سے اتنی ہی امداد لیں گے جو ان کی مساعی کی کامیابی کے لیے خود حکومت کے قواعد کے مطابق حاصل کرنے کے وہ مستحق ہوں گے۔ کسی قوم کو یہ سب مقاصد جب تک کہ وہ خود ان مقاصد کے حاصل کرنے پر مستعد نہ ہو حاصل نہیں ہو سکتے۔ پس ہم کو اپنے تمام مقاصد کے انجام کو صرف گورنمنٹ ہی پر منحصر رکھنا نہ چاہیے۔ بلکہ یقین کرنا چاہیے کہ ان تمام مقاصد کا گورنمنٹ سے حاصل ہونا غیر ممکن ہے۔ پس ہم کو دو قسم کی تجویزیں کرنی چاہئیں۔ ایک تو کامل اور پوری، ادنیٰ سے اعلیٰ درجہ تک تعلیم کی جو ہمارے تمام مقاصد کو پوری کرسکیں اور جن میں ہم کو گورنمنٹ سے اس کی تعمیل کرانے کی کچھ خواہش نہ ہو بلکہ خود اپنی سعی و کوشش سے

اس کا انجام کرنا مدنظر ہو۔ اور دوسری تجویز اس بات کی کرنی چاہیے کہ جب تک کہ ہم اس اول تجویز کو انجام دیں یا اس کو انجام دینے کے لائق ہوں اس وقت تک ان اصول و قواعد سے جو گورنمنٹ نے تعلیم کے لیے مقرر کیے ہیں کیونکر فائدہ اٹھا دیں اور ہمارے متعدد مقصدوں میں سے جو مقصد حاصل ہو سکتے ہیں وہ کیونکر حاصل کریں۔ لوگ خود ہی اپنی تعلیم کا اہتمام کریں اس خیال پر سرسید سختی سے قائم تھے اور ایجوکیشنل کمیشن کے سامنے بیان دیتے ہوئے بھی انھوں نے یہ کہا تھا کہ اگرچہ میرا یہ خیال لوگوں کی عام رائے سے مختلف ہے مگر میں نے پورے غور و فکر کرنے کے بعد یہ رائے قائم کی ہے کہ جب تک لوگ اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں نہ لیں گے اس وقت تک مناسب طور پر ان کی تعلیم کا انتظام ہونا ممکن نہیں ہے۔ اور ملک کے لیے یہ زیادہ مفید ہوگا کہ گورنمنٹ تعلیم کا تمام تر اہتمام لوگوں پر چھوڑ دے اور خود اس میں دست اندازی سے بالکل علاحدہ ہو جائے۔

جدید علوم کی ضرورت

نصاب تعلیم میں تبدیلی بھی ایک اہم مسئلہ تھا اور اس کی ضرورت واضح کرتے ہوئے سرسید نے یہ کہا کہ جب مسلمانوں میں کچھ تعلیم کی تحریک ہوتی ہے تو ان کی سعی ہمیشہ اسی بات پر مقصود ہوتی ہے کہ وہی پرانا موروثی طریقۂ تعلیم کا اور وہی ناقص سلسلہ نظامیہ درس کتب کا اختیار کیا جاتا ہے۔ مگر میں نہایت سچے دل سے کہتا ہوں کہ وہ محض بے فائدہ اور محض لغو ہیں اور ان سے کچھ بھی قومی فائدہ ہونے کی توقع نہیں۔ زمانہ اور زمانے کی طبیعت اور علوم اور علوم کے نتائج سب تبدیل ہو گئے ہیں۔ ہمارے ہاں کی قدیم کتابیں اور ان کا طرز بیان اور ان کے الفاظ مستعملہ ہم کو آزادی اور راستی اور صفائی اور اصلیت تک پہنچنا ذرا بھی تعلیم نہیں کرتیں بلکہ برخلاف اس کے دھوکے میں پڑنا اور پیچیدہ بات کہنا، جھوٹی تعریف کرنا اور زندگی کو غلامی کی حالت میں رکھنا سکھاتی ہیں۔ اور اس لیے بجائے اس کے کہ مسلمانوں کو ان سے کچھ فائدہ ہو مضرت حاصل ہونے کی توقع ہے۔ اور یہی کس قدر بڑی مضرت ہے کہ

ان کو پڑھ کر عمر بے فائدہ چیز میں ضائع کی جاتی ہے۔ اپنے اس خیال کو سرسید نے زیادہ واضح طور پر گورکھپور میں تقریر کرتے ہوئے یوں ظاہر کیا تھا کہ دنیاوی تعلیم ایسی ہونی چاہیے جس سے کچھ دنیا کا کام چلے۔ پس ضرور ہوا کہ ہم وہ دنیاوی علوم اپنی تعلیم میں داخل کریں جو درحقیقت دنیا کے کام کے ہیں۔ اگر ہم صرف یہی مقصد رکھیں کہ وہی پرانا فلسفہ ہیئت اور منطق پڑھا دیں اور ان علموں سے کچھ سروکار نہ رکھیں جو آج ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں تو ہم درحقیقت اپنی قوم کے ساتھ کچھ بھلائی نہیں کریں گے۔ جو علوم ہماری قوم میں سات سو برس پہلے تعلیم میں داخل ہوئے تھے اگر آج ہم انھیں علوم پر قناعت کریں تو گویا ہم اپنی قوم کو حال کی ترقی سے سات سو برس پیچھے لے جائیں گے۔ پس ہم کو بڑی مضبوطی سے ارادہ کرنا چاہیے کہ جس قدر علوم دنیاوی تعلیم سے متعلق ہیں مثلاً الجبرا ویوکلڈ، زوالوجی، جیالوجی، لاجک، مارل فلاسفی، کیمسٹری اور تمام علوم جو ترقی یافتہ قوموں میں رائج ہیں بڑے اہتمام سے اور کامل طور سے تعلیم دیں۔ اپنے اس خیال کے مطابق کہ مسلمان اپنی تعلیم کا خود اہتمام کریں اور یورپ کے نئے علوم سے فائدہ اٹھائیں سرسید نے جدید علوم و فنون کی تعلیم کے لیے ایک ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا اور برطانیہ کے طرزِ تعلیم و تربیت کا غائر مطالعہ کر کے مسلمانوں کے لیے ایک کالج قائم کرنے کا منصوبہ بنایا اور بڑی جدوجہد کے بعد اس منصوبے کو عملی شکل دینے میں کامیاب ہوئے۔

تعلیمی ترقی کے لیے عملی کوششیں

سرسید اس حقیقت کو پوری طرح محسوس کرتے تھے کہ مسلمانوں میں جو خرابیاں پیدا ہو گئی ہیں ان کا ایک بہت بڑا اور بنیادی سبب عوام کی جہالت اور تعلیم یافتہ طبقہ کی ناقص تعلیم و تربیت ہے۔ اور معاشرہ کی حالت درست کرنے کے لیے جن اصلاحات کی ضرورت ہے وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتیں جب تک کہ قوم کی تعلیمی حالت کو بہتر نہ بنایا جائے

لیکن اس زمانے میں ہندوستان کے جو حالات تھے ان میں تعلیم کی اصلاح کرنا اور اس کو پھیلانا بڑا ہی مشکل کام تھا۔ ملک پر ایک غیر قوم کی حکومت تھی اور اس سے یہ توقع نہیں کی جا سکتی تھی کہ وہ پوری قوم کی تعلیم کا انتظام کر سکے گی یا سرکاری مدارس میں مسلمانوں کے لیے جدید تعلیم کے ساتھ ساتھ اچھی اور مفید مذہبی تعلیم کا بھی بندوبست کرے گی۔ تعلیم کی ترقی میں دوسری رکاوٹ یہ تھی کہ مسلمان قوم تقریباً ایک ہزار سال سے ایک ایسے طرزِ تعلیم کی پابند چلی آرہی تھی جس میں عقلی و نقلی ہر قسم کے علوم کو ایک قسم کی مذہبی نوعیت دیدی گئی تھی اور اس میں تبدیلی کا تصور تک نہ کیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں طرزِ تعلیم اور مروجہ علوم کو بدل کر نئے اور مفید علوم و فنون سکھانے کے لیے مغربی طرز کے ادارے قائم کرنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ سرسید ان مشکلات کو محسوس کرتے تھے لیکن یہ بھی خوب جانتے تھے کہ جب تک ان مشکلات کو دور کر کے تعلیمی حالت درست نہ کی جائے گی مسلمان کسی صورت میں بھی ترقی نہ کر سکیں گے۔

مدارس کا قیام

۱۸۳۵ء میں حکومت نے ہندوستان میں انگریزی تعلیم جاری کی۔ ہندوؤں نے تو اس سے پورا فائدہ اٹھایا۔ لیکن مسلمانوں نے اس کی شدید مخالفت کی۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تعلیمی اعتبار سے بہت پیچھے رہ گئے۔ اور نہ صرف تعلیمی بلکہ معاشرتی اور اقتصادی لحاظ سے بھی مسلمانوں پر اس کا بُرا اثر پڑا۔ سرسید نے جب یہ حالت دیکھی تو انھوں نے مسلمانوں میں تعلیم کی اشاعت کا ارادہ کیا۔ چنانچہ ۱۸۵۹ء میں مرادآباد میں ایک مدرسہ قائم کیا۔ اور تعلیم کے بارے میں اردو اور انگریزی دونوں زبانوں میں ایک رسالہ لکھا جس میں سرکاری مدرسوں کی تعلیم اور انتظام میں خرابیوں پر اعتراض کیا اور انگریزی تعلیم کی ضرورت اور اس کے فوائد بیان کیے۔ ۱۸۶۴ء میں سرسید نے ایک اور مدرسہ غازی پور میں قائم کیا۔ جس کی عمارت اور اخراجات کے لیے چندہ جمع کیا اور اس کے افتتاح کے موقع پر اس بات کو واضح کر دیا کہ ہندوستان اسی وقت ترقی کر سکے گا جب اس ملک میں بسنے والی قومیں اپنی مدد آپ کرنے کے اصول پر عمل

کریں گی اور اپنی تعلیم کا اہتمام اپنے ہاتھ میں لیں گی۔ اس مدرسہ میں انگریزی، اردو، فارسی، عربی، اور سنسکرت کی تعلیم کا انتظام کیا گیا اور اس کے لیے ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی جس میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے۔ سرسید کا خیال تھا کہ اس مدرسہ کو کالج بنا دیں لیکن اسی سال غازی پور سے ان کا تبادلہ ہو گیا اور یہ منصوبہ پورا نہ ہو سکا۔

سائنٹفک سوسائٹی

سرسید یہ چاہتے تھے کہ مسلمان جدید علوم و فنون سے واقف ہوں اور پرانے مروجہ علوم کے بجائے جو ان کے لیے بالکل بے کار تھے نئے اور مفید علوم حاصل کریں۔ لیکن نئے علوم کی کتابیں انگریزی میں تھیں اور مسلمان انگریزی سے نفرت کرتے تھے۔ اس مشکل پر قابو پانے کے لیے سرسید نے یہ تدبیر سوچی کہ نئے علوم و فنون کی کتابوں کا اردو میں ترجمہ کر کے مسلمانوں میں ان کتابوں کی اشاعت کی جائے۔ اس سے دو فائدے ہوں گے۔ ایک تو یہ کہ مسلمان نئے علوم سے واقف ہونے لگیں گے اور دوسرے ان کو یہ اندازہ ہو جائے گا کہ انگریزی میں کیسی مفید اور کارآمد کتابیں ہیں۔ اس طرح رفتہ رفتہ انگریزی سے ان کی نفرت کم ہونے لگے گی اور وہ اس زبان کو سیکھنے کی طرف مائل ہو جائیں گے۔ اپنے اس خیال کے مطابق سرسید نے ۱۸۶۲ء میں ایک تحریر "التماس بخدمت ساکنانِ ہند و ارباب ترقی تعلیم اہل ہند" کے عنوان سے شائع کی جس میں ایک ایسی مجلس قائم کرنے کی ضرورت بیان کی جو اپنے قدیم مصنفوں اور انگریزوں کی مفید کتابیں اردو میں ترجمہ کر کے شائع کرے۔

مجلس کے مقاصد اور اس کی ضرورت سے لوگوں کو بخوبی آگاہ کرنے کے بعد سرسید نے غازی پور میں سائنٹفک سوسائٹی کے نام سے ایک مجلس قائم کی۔ اس وقت کے وزیر ہند سوسائٹی کے سرپرست اور شمال مغربی صوبہ اور پنجاب کے گورنر نائب سرپرست بنائے گئے۔ اور ہندو اور مسلمان رئیس اس کے ممبر بن گئے۔ سوسائٹی نے مفید کتابوں کے ترجمے کا کام باقاعدہ شروع کر دیا اور علمی حلقوں میں اس کی مقبولیت بڑھنے لگی۔ ۱۸۶۴ء میں سرسید کا

تبادلہ علی گڑھ ہوگیا اور سوسائٹی کا دفتر علی گڑھ منتقل کر دیا گیا۔ یہاں سوسائٹی نے بڑی ترقی کی۔ اس کے لیے شاندار عمارت بنائی گئی۔ مستقل عملہ رکھا گیا۔ بڑے بڑے عطیے ملنے لگے۔ اور کافی تعداد میں بہت مفید کتابوں کا ترجمہ کیا گیا۔ ۱۸۶۶ء میں سرسید نے علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ کے نام سے سوسائٹی کا ایک ہفتہ وار اخبار بھی نکالا جو کچھ عرصہ کے بعد سہ روزہ ہوگیا۔ اس اخبار سے اصلاحی تحریک کو مقبول بنانے میں بہت کام لیا گیا۔ سرسید آخر دم تک اس میں مضامین لکھتے رہے۔ اخبار کا ایک کالم اردو میں ہوتا تھا اور ایک انگریزی میں اور اس میں علمی، اخلاقی، سیاسی اور معاشرتی ہر قسم کے مضامین شائع ہوتے تھے۔ اور ان موضوعات پر سوسائٹی میں جو لکچر دیے جاتے تھے وہ بھی اس اخبار میں شائع کر دیے جاتے تھے تاکہ لوگ ان سے زیادہ استفادہ کر سکیں۔ سرسید کی اصلاحی تحریک میں اس اخبار کی بڑی اہمیت تھی اور لوگوں کے خیالات بدلنے اور معاشرہ کی خرابیاں دور کرنے کا احساس پیدا کرنے میں اس نے کافی حصہ لیا۔

اردو یونیورسٹی کی تحریک

ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت ختم ہونے کے بعد ہندوستان کا برطانوی پارلیمنٹ سے قریبی تعلق ہوگیا اور سرسید کا یہ خیال تھا کہ ہندوستانیوں کو اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے پارلیمنٹ سے ربط قائم کرنا چاہیے۔ اسی مقصد کے تحت انھوں نے ۱۸۶۶ء میں برٹش انڈین اسوسی ایشن قائم کی تھی جس کے ذریعہ ہندوستانیوں کے مقاصد و مطالب سے حکومت ہند اور پارلیمنٹ کو آگاہ کیا جاتا تھا۔ سرسید چاہتے تھے کہ ہندوستانیوں کو اردو میں اعلیٰ تعلیم دینے کے لیے ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ چنانچہ انھوں نے برٹش انڈین ایسوسی ایشن کی طرف سے وائسرائے و گورنر جنرل ہند سے یہ درخواست کی کہ اعلیٰ درجہ کی تعلیم کا ایک ایسا سررشتہ قائم کیا جائے جس میں بڑے بڑے علوم و فنون کی تعلیم دیسی زبان میں دی جائے۔ اسی زبان میں ان مضامین کا سالانہ امتحان لیا جائے جو کلکتہ یونیورسٹی

میں پڑھائے جاتے ہیں۔ علم کی مختلف شاخوں میں انگریزی میں تعلیم پانے والے طلباء کو لیاقت کے اعتبار سے جو سندیں دی جاتی ہیں وہی دیسی زبان میں امتحان پاس کرنے والے طلباء کو بھی دی جائیں۔ اور اس مقصد کے لیے یا تو کلکتہ یونیورسٹی میں اردو کا الگ شعبہ قائم کر دیا جائے یا شمال مغربی اضلاع میں اردو کی ایک یونیورسٹی قائم کی جائے۔ اس درخواست میں یہ بھی لکھا گیا تھا کہ اس غرض کے لیے انگریزی سے اردو میں کتابوں کا ترجمہ کرنے کا کام جہاں تک ممکن ہو سکے گا سائنٹی فک سوسائٹی انجام دے گی۔

حکومت نے اس درخواست پر بہت توجہ کی اور گورنر جنرل نے اس تجویز کو پسند کیا۔ ہندوستان کے تعلیم یافتہ اور روشن خیال طبقہ میں جس میں مسلمان اور ہندو دونوں شامل تھے اردو یونیورسٹی قائم کرنے کا خیال بہت مقبول ہوا اور ان میں یہ بحث چھڑ گئی کہ مجوزہ یونیورسٹی لکھنؤ، دہلی اور لاہور میں سے کہاں قائم کی جائے۔ اس دوران میں سرسید کو یہ علم ہوا کہ حکومت کا ارادہ یہ ہے کہ کلکتہ یونیورسٹی کو توڑ کر اس کی جگہ ورنیکلر یونیورسٹی قائم کی جائے اور انگریزی کی تعلیم صرف ثانوی زبان کی حیثیت سے جاری رہے۔ سرسید کو اس خیال سے اتفاق نہ تھا کہ انگریزی کی حیثیت صرف ایک ثانوی زبان کی رہے اور کسی یونیورسٹی میں اس کو ذریعہ تعلیم نہ بنایا جائے۔ وہ اس چیز کو علمی ترقی اور قومی مفاد کے لیے نقصان رساں خیال کرتے تھے۔ اور کلکتہ یونیورسٹی کو ختم کر دینے کے بجائے یہ چاہتے تھے کہ یا تو اس یونیورسٹی میں اردو کا الگ شعبہ قائم کیا جائے جو اردو میں تمام علوم کی تعلیم دے یا اردو یونیورسٹی الگ قائم کی جائے اور کلکتہ یونیورسٹی میں انگریزی میں تعلیم بدستور جاری رہے۔ دوسری طرف اردو کے مخالفوں نے یہ کہنا شروع کیا کہ حکومت جو یونیورسٹی قائم کرنا چاہتی ہے اس میں مسلمانوں کے لیے اردو اور ہندوؤں کے لیے ہندی زبان مختص کر دی جائے۔ اگرچہ ان لوگوں کی تعداد بہت تھوڑی تھی اور سمجھ دار ہندو بہت بڑی تعداد میں اردو میں تعلیم کے حامی تھے۔ لیکن کئی

مسائل پر اختلاف ہونے کے باعث اردو یونیورسٹی قائم نہ ہو سکی۔

برطانوی طرزِ تعلیم کا مطالعہ

ہندوستان میں مسلمانوں کی تعلیم کی اصلاح و ترقی کے بارے میں سرسید کا جو یہ نظریہ تھا کہ مسلمان جدید علوم حاصل کریں اور اس کے لیے خود اسکول اور کالج قائم کریں اس کے مطابق انھوں نے ایک نہایت عمدہ اور جدید طرز کا تعلیمی ادارہ قائم کرنے کا ارادہ کیا۔ ان کا یہ خیال تھا کہ اعلیٰ پیمانے پر جدید قسم کی درس گاہ قائم کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ انگلستان جا کر وہاں کے طرزِ تعلیم سے پوری واقفیت حاصل کریں اور اس کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے درس گاہ قائم کرنے کا منصوبہ بنائیں۔ چنانچہ انھوں نے انگلستان کا جو سفر کیا اس کے مقاصد میں ایک بڑا مقصد اس ملک کے طریقۂ تعلیم کو دیکھنا اور اس پر غور کرنا بھی تھا۔ اس غرض سے انھوں نے کیمبرج یونیورسٹی کو خود جا کر دیکھا اور بڑی سے بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز پر جو یونیورسٹی اور اس کے طرزِ تعلیم سے علاقہ رکھتی تھی پوری طرح غور کیا اور تمام باتوں کو ذہن نشین رکھ کر ایک ایسا منصوبہ بنایا جو ہندوستان کے مسلمانوں کے حالات کے مطابق اور ان کے لیے مفید ہو۔

انگلستان میں سرسید نے معاشرتی اور تعلیمی امور کا اس نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا تھا کہ وہ ہندوستانی مسلمانوں کی حالت کو بہتر بنانے میں کہاں تک مفید ہو سکتے ہیں۔ اور بقول مولانا حالی سرسید کے تمام منصوبے جو وہ ابتدا سے مسلمانوں کی بھلائی کے لیے برابر باندھتے رہتے تھے اس رائے پر آ کر مکمل ہو گئے کہ ہندوستان چل کر قوم کی تعلیم کے لیے ایک محمڈن کالج یا محمڈن یونیورسٹی قائم کی جائے۔ انھوں نے دیکھا کہ مسلمانوں کی سوشل اور پولیٹیکل حالت درست کرنے کے لیے ایسوسی ایشن قائم کرنا یا کاغذ کی ناؤ سے اس دریا کو طے کرنا کسی طرح ممکن نہیں۔ بلکہ جب تک ان میں انگریزی تعلیم نہ پھیلائی جائے گی ان کی بھلائی کی تمام تدبیریں ایسی ہی فضول اور بے کار ثابت ہوں گی جیسے کسی کھیت میں تخم ریزی سے پہلے آب پاشی کرنا۔ چنانچہ انھوں نے پختہ ارادہ کر لیا کہ اپنی تمام زندگی

اس کام کے لیے وقف کر دیں اور اس مقصد کے لیے تمام مدارج جو ولایت میں طے ہونے ممکن تھے انھوں نے وہیں طے کر لیے۔ ہندوستان واپس آنے کے بعد سرسید محمڈن کالج کے قیام کی کوشش میں ہمہ تن مصروف ہو گئے۔ اور اس کو اپنا ایک مقصدِ حیات بنا لیا۔

کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیم مسلمانان

انگلستان سے واپسی کے بعد سرسید کی اصلاحی کوششوں نے ایک پُرجوش اور منظم تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اور اپنے مقاصد کی اشاعت کے لیے انھوں نے "تہذیب الاخلاق" جاری کیا جس نے غور و فکر کی صلاحیت رکھنے والے مسلمانوں کو کافی متاثر کیا۔ یہ رسالہ کالج کے قیام کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں بھی بہت کارآمد ثابت ہوا۔ سرسید یہ چاہتے تھے کہ تمام امور پر خوب غور کرنے کے بعد کالج کے منصوبے کو قطعی شکل دی جائے۔ چنانچہ انھوں نے دسمبر ۱۸۷۰ء میں "کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیم مسلمانانِ ہندوستان" کے نام سے ایک کمیٹی بنائی جس کا کام یہ معلوم کرنا تھا کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مسلمان طالب علم کس لیے کم پڑھتے ہیں۔ علومِ قدیمہ ان میں کیوں گھٹ گئے اور علومِ جدیدہ کیوں رواج نہیں پاتے۔ کمیٹی کے ذمہ یہ کام بھی کیا گیا کہ جب وہ ان امور کے متعلق معلومات فراہم کر لے تو ان کو دور کرنے کی تدبیریں بتلائے اور ان تدبیروں پر عمل کرنے کی کوشش کرے۔ ان مسائل پر تعلیم یافتہ طبقہ کی رائے معلوم کرنے کے لیے اچھے مضمون لکھنے والوں کو انعام دینے کا اعلان کیا گیا اور جو مضامین موصول ہوئے ان کی مدد سے سرسید نے ایک رپورٹ مرتب کر کے کمیٹی کے سامنے پیش کی۔ اس رپورٹ میں سرسید نے یہ بتلایا تھا کہ سمجھدار مسلمان انگریزی تعلیم کے خلاف تعصب کو مسلمانوں کے لیے مضر خیال کرتے ہیں۔ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کی تعداد بہت کم ہے اور جن اسباب سے مسلمان ان مدارس میں نہیں پڑھتے ان میں کچھ ناواجبی اور اکثر واجبی ہیں۔ مسلمانوں کی تعلیمی ضرورتوں کے لیے سرکاری طریقۂ تعلیم ناکافی ہے۔ اور مسلمانوں کو اپنی ضروریات کے مطابق اپنی اولاد کی تعلیم و تربیت کا انتظام خود کرنا چاہیے۔ سرسید کی اس رپورٹ میں مجوزہ کالج کی اسکیم بھی شامل تھی اور طریقۂ تعلیم کی بھی وضاحت کی گئی تھی۔

سرکاری اسکولوں سے تنفر کے اسباب

حکومت نے انگریزی کی تعلیم جاری کر دی تھی اور وہ چاہتی تھی کہ مسلمان بھی ان مدارس سے فائدہ اٹھائیں لیکن مسلمانوں نے اس طرف کوئی توجہ نہیں کی۔ تعلیم کی اشاعت کے لیے حکومت طرح طرح سے ترغیب دیتی تھی۔ اور حکومت کے ہاتھ میں مسلمانوں کے کئی بڑے اوقاف بھی تھے جن کی آمدنی تعلیم پر صرف کی جاتی تھی۔ لیکن مسلمانوں کے ان تعلیمی اوقاف سے بھی ہندو ہی فائدہ اٹھاتے تھے اور مسلمان کسی طرح بھی سرکاری اسکولوں میں تعلیم حاصل کرنے پر راضی نہ ہوتے تھے آخر مسلمان سرکاری اسکولوں اور کالجوں میں کیوں نہیں پڑھتے؟ یہ ایک اہم اور غور طلب مسئلہ تھا اور بہت غور و فکر کے بعد اس کے اسباب یہ قرار دیے گئے تھے کہ سرکاری کالجوں اور اسکولوں میں مذہبی تعلیم نہیں دی جاتی اس لیے مسلمان ان میں شریک نہیں ہوتے۔ یہ خیال عام ہے کہ انگریزی اداروں میں تعلیم پانے سے مسلمان طلبا لامذہب ہو جاتے ہیں اس لیے مسلمان اپنے بچوں کو ان اداروں میں داخل کرنا پسند نہیں کرتے۔ ان اداروں کے بارے میں یہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہاں پڑھنے سے اخلاق و آداب خراب ہو جاتے ہیں۔ لڑکے گستاخ اور مغرور ہو جاتے ہیں اور بزرگوں کا ادب و احترام ان کے دلوں سے نکل جاتا ہے۔ چنانچہ لوگ ان اداروں کو سخت ناپسند کرتے ہیں۔ انگریزی اسکولوں اور کالجوں کے خلاف لوگوں میں یہ تعصب بھی موجود ہے کہ شریعت کی رو سے ان میں تعلیم پانا حرام اور ناجائز ہے۔ اور یہ خیال ان اداروں میں مسلمانوں کے داخل ہونے میں بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں شریف اور رذیل طبقہ کے لڑکوں میں جو اختلاط ہوتا ہے اس کو پسند نہیں کیا جاتا اور شریف خاندان کے لوگ اس کے بہت مخالف ہیں۔ لوگوں میں یہ خیال بھی ہے کہ اس تعلیم کا کوئی نتیجہ نہیں اور انگریزی تعلیم حاصل کرنے کے بعد بھی اچھی نوکری نہیں ملتی اس لیے لوگ اس تعلیم کو بے فائدہ سمجھتے ہیں۔ انگریزی اسکولوں اور کالجوں میں مسلمانوں کے شریک نہ ہونے کی ایک وجہ افلاس بھی ہے۔ مسلمان عام طور پر مفلس ہو گئے ہیں اور وہ کالجوں اسکولوں کے مصارف برداشت نہیں کر سکتے۔

کالج قائم کرنے کا فیصلہ

تمام امور پر غور کرنے کے بعد مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کا ایک کالج قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا جس کی اسکیم سرسید نے تیار کر لی تھی۔ کمیٹی کی رپورٹ مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو بھی ارسال کی گئی اور ان کو کالج کے قیام سے مطلع کیا گیا۔ گورنر جنرل نے اس پر اپنی مسرت کا اظہار کیا کہ مسلمانوں کی اعلیٰ تعلیم کے لیے اینگلو اورینٹل کالج قائم کیا جا رہا ہے۔ اور صوبائی حکومتوں نے بھی قواعد کے بموجب امداد دینے کا وعدہ کیا۔ کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کی غرض سے ایک کمیٹی بنائی گئی جس کا نام "خزینۃ البضاعۃ لتاسیس مدرسۃ المسلمین" رکھا گیا اور اس کمیٹی کے سیکریٹری سرسید بنائے گئے۔ سرسید نے اشتہار دے کر مسلمانوں سے پوچھا کہ مجوزہ کالج کہاں قائم کیا جائے۔ زیادہ تعداد نے علی گڈھ کو پسند کیا اور آخر کار اسی کے حق میں فیصلہ ہوا۔ فروری ۱۸۷۳ء میں سید محمود نے انگلستان کے اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام اور طریقۂ تعلیم کو پیش نظر رکھ کر مجوزہ کالج کے لیے ایک اسکیم پیش کی جس کو کمیٹی خواستگارِ ترقی تعلیم نے پسند کیا اور اس کی نقلیں مرکزی اور صوبائی حکومتوں کو ارسال کر کے حسب وعدہ امداد کا مطالبہ کیا گیا۔ سرسید نے کالج کے لیے چندہ جمع کرنے کی مہم بڑے زور شور سے شروع کر دی اور اس کے لیے تمام ممکن تدبیریں اختیار کیں۔ سمجھدار مسلمان تو اس سے بہت خوش تھے کہ مسلمانوں کے لیے اعلیٰ درجہ کا کالج قائم کیا جا رہا ہے۔ لیکن قدامت پرست اور کوتاہ نظر عناصر نے شدید مخالفت کا ہنگامہ برپا کر دیا اور سرسید اور ان کے رفقا کے خلاف طرح طرح کی غلط باتیں مشہور کر کے ان کے کافر ہونے کا فتویٰ تک حاصل کر لیا۔ لیکن سرسید اپنی دُھن کے پکّے تھے اور انھوں نے پورے عزم و استقلال سے اپنا کام جاری رکھا۔

ابتدائی مدرسہ کا قیام

مجوزہ کالج کے لیے ایک جامع اسکیم پیش کرنے کے ساتھ ہی سید محمود نے یہ تحریک بھی کی تھی کہ مجوزہ کالج کا ماتحت مدرسہ بہت جلد قائم کر دیا جائے تاکہ اس کو لوگوں کے سامنے نمونے کے

طور پر پیش کیا جا سکے۔ دسمبر ۱۸۷۳ء میں کمیٹی خواستگار ترقی تعلیم نے یہ تجویز منظور کر لی اور علی گڑھ میں ماتحت مدرسہ قائم کرنے کا فیصلہ کیا گیا تاکہ لوگوں پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اس درس گاہ میں کس قسم کی تعلیم دی جاتی ہے اور مخالفوں کا یہ پروپیگنڈا بالکل غلط ہے کہ مجوزہ کالج میں جو تعلیم دی جائے گی وہ اسلام کے خلاف ہوگی۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو اس مدرسہ کا افتتاح ہوا اور یکم جون سے باقاعدہ تعلیم شروع ہو گئی۔

کالج کا قیام

ابتدائی مدرسہ قائم ہو جانے کے بعد پوری توجہ کالج کے قیام پر مرتکز ہو گئی۔ سرسید پنشن لیکر علی گڑھ آ گئے اور وہاں مستقل سکونت اختیار کر لی۔ اب سرسید نے اپنا تمام وقت اور تمام کوششیں اور صلاحیتیں کالج کے لیے وقف کر دیں۔ ۸ جنوری ۱۸۷۷ء کو لارڈ لٹن وائسرائے ہند نے کالج کا سنگِ بنیاد رکھا جس کا نام انگریزی میں محمڈن اینگلو اورینٹل کالج اور اردو میں مدرسۃ العلوم تجویز کیا گیا تھا۔ کالج کی عمارتوں کے بارے میں سرسید کا شروع ہی سے یہ خیال تھا کہ تمام عمارتیں بہت خوش نما اور نہایت شاندار ہوں تاکہ لوگوں پر اس کا اچھا اثر پڑے اور آئندہ نسلوں کو اپنا ایک باعظمت ادارہ دیکھ کر اس کو قائم رکھنے اور ترقی دینے کا خیال پیدا ہو۔ چنانچہ سرسید بہت شاندار عمارتیں بنوانے لگے جن میں کالج کی متعدد عمارتوں اور اقامت خانوں کے علاوہ ایک بہت بڑی اور خوبصورت مسجد تعمیر کرنے کا منصوبہ بھی شامل تھا اور ان عمارتوں کے لیے روپیہ فراہم کرنے میں سرسید کو بے انتہا کوشش کرنی پڑی۔ مگر وہ اپنے مقصد میں آخر کار کامیاب ہوئے۔

یکم جنوری ۱۸۷۸ء کو کالج کلاسوں کا آغاز ہوا۔ اور مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کا نیا دور شروع ہو گیا۔ جیسا کہ سرسید کا خیال تھا اس کالج میں تعلیم اور تربیت دونوں پہلوؤں کو پوری طرح ملحوظ رکھا گیا۔ نصاب تعلیم میں جدید اور مفید علوم کو داخل کیا گیا۔ اور اس کے ساتھ ہی مذہبی تعلیم کو بھی پوری اہمیت دی گئی۔ طلباء کی تربیت میں اس بات کا خاص طور پر خیال رکھا جاتا تھا کہ وہ ذہنی اور جسمانی ہر اعتبار سے پوری طرح صحت مند ہوں اور ان میں وہ خرابیاں باقی نہ رہیں

جو ہندوستانی معاشرہ میں پیدا ہو گئی تھیں۔ یہ خرابیاں دور کرنے کے علاوہ اس تربیت کا مقصد طلباء میں وہ اوصاف پیدا کرنا تھا جو معاشرہ کی بہتری اور ملک و ملت کی فلاح و ترقی کے لیے ضروری ہیں۔ سرسید کی اس تعلیم و تربیت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے کالج کے طلباء نے تعلیم کی خوبی، تہذیب و شائستگی، رہنے سہنے کے طریقے، ترقی پسند رجحانات، اچھے اخلاق، مضبوط کردار، دینی اخوت اور روشن خیالی کی وجہ سے رفتہ رفتہ امتیازی حیثیت حاصل کر لی۔ سرسید اس کالج کو یونیورسٹی بنانے کا خیال رکھتے تھے جو ان کی زندگی میں پورا نہ ہو سکا۔ لیکن ان کے بعد اس کالج نے مسلم یونیورسٹی کی شکل اختیار کر لی اور نہ صرف اسلامی ہند بلکہ پورے ہندوستان میں اپنی نوعیت کا سب سے بڑا ادارہ بن گئی۔

محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس

مدرسۃ العلوم کے قیام سے سرسید کی جد و جہد نے تعلیمی اصلاح اور قومی ترقی کی ایک نہایت اہم منزل بڑی کامیابی سے طے کر لی اور ان کے منصوبے عمل حقیقت بن کر سامنے آ گئے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سرسید کو یہ خیال ہوا کہ صرف ایک کالج قائم کر دینے سے پوری مسلمان قوم کی تعلیم کا مسئلہ حل نہیں ہو جاتا۔ یہ کالج درحقیقت ایک نمونہ ہے اور اسی نمونہ پر ملک کے مختلف صوبوں اور حصوں میں مسلمانوں کے لیے تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔ اس مقصد کے لیے انھوں نے ایک ایسی تنظیم کی ضرورت محسوس کی جو ملک کے مختلف حصوں کے مسلمانوں کو اس کا موقع دے کہ وہ ایک جگہ جمع ہو کر اپنی قومی تعلیم اور معاشرتی ترقی کے مسائل پر غور اور تبادلۂ خیال کر سکیں اور مدرسۃ العلوم کے نمونہ پر متعدد ادارے مختلف حصوں میں قائم کرنے کی کوشش کریں۔ مسلمانوں میں یہ اتحاد عمل اور مقاصد میں ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے سرسید نے ۱۸۸۶ء میں محمڈن ایجوکیشنل کانفرنس قائم کی جس کے مقاصد یہ قرار دیے گئے۔ مسلمانوں میں مغربی تعلیم کو اعلیٰ درجہ تک پہنچانے کی کوشش کرنا۔ مسلمانوں کی تعلیم کے لیے جو انگریزی مدرسے مسلمانوں کی طرف سے قائم ہوں ان میں مذہبی تعلیم کے حالات دریافت کرنا اور تا بمقدور عمدگی سے اس تعلیم

کے انجام پانے میں کوشش کرنا۔ علوم مشرقی اور دینیات کی تعلیم جو علمائے اسلام جابجا خود دیتے ہیں اس کو تقویت دینا اور اس کو جاری رکھنے کی مناسب تدبیریں عمل میں لانا۔ دیسی مکتبوں میں جو تعلیم قدیم طرز پر جاری ہے اس کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان میں جو تنزل ہو گیا ہے اس کی ترقی اور توسیع کی تدبیریں اختیار کرنا۔ اور قرآن خوانی اور حفظِ قرآن کے لیے جو مکتب جاری ہیں اور جن کو روز بروز تنزل ہوتا جاتا ہے ان کے حالات کی تفتیش کرنا اور ان مکتبوں کو قائم رکھنے اور استحکام دینے کی تدبیریں عمل میں لانا۔

اس کانفرنس کے بارے میں یہ طے پایا کہ ہر سال کسی مناسب مقام پر اس کا اجلاس ہوا کرے جس میں مسلمانوں کی تعلیمی ترقی کی تجاویز پر غور کر کے ان کے بارے میں فیصلہ کیا جائے۔ جہاں تک ممکن ہو سکے ہر شہر اور قصبہ میں کانفرنس کی شاخیں قائم کی جائیں جو اپنے علاقہ کے مدارس و مکاتب اور صنعت و حرفت، تجارت اور زراعت کی حالت سے مرکزی دفتر کو مطلع کرتی رہیں۔ اس کانفرنس نے بہت سی عمدہ تجاویز منظور کیں مثلاً مسلمانوں کی تعلیمی مردم شماری کرنا، قرآن مجید کی تعلیمات کی اشاعت کرنا، اسلامی انجمنوں کے تعاون سے مسلمان طلبا کے لیے وظائف اور تعلیمی سہولتیں بہم پہنچانا۔ سرکاری مدارس میں مسلمانوں کے لیے دینی تعلیم کا انتظام کرنے کی کوشش کرنا۔ تعلیم نسواں کے لیے مذہب اسلام اور طریقۂ شرفائے اہل اسلام کے مطابق مدرسے جاری کرنا۔ مسلمان طلباء کے لیے آسان زبان میں اخلاقی رسالے اور کتابیں شایع کرنا۔ مسلمانوں کی قدیم اور نایاب کتابوں کا جو کہ اب نادر الوجود ہیں پتہ لگانا اور ان کو حاصل کرنا۔ مسلمانوں کی علمی خدمات کے متعلق تحقیقات کرنا اور یورپ کے مورخوں نے مسلمانوں پر جو غلط الزامات لگائے ہیں ان کا نہایت مدلل طور پر جواب دے کر غلط فہمیوں کا ازالہ کرنا۔ کانفرنس کی تحریک پر بہت سے تحقیقی مقالے اور رسالے لکھے گئے اور متعدد کتابیں بھی شایع ہوئیں۔ اس طرح یہ کانفرنس مسلمانوں کی علمی سرگرمیوں کا محور بن گئی اور سرسید کی وفات کے بعد بھی روز افزوں ترقی کرتی رہی۔ اس طرح

مسلمانوں کے لیے ایک ملک گیر تعلیمی تنظیم قائم کرنے کے منصوبے کو عملی شکل دی گئی اور تعلیم کی ترقی و اصلاح کی کوششوں میں جو معاشرہ کی اصلاح کے لیے ناگزیر تھیں، سرسید شدید مخالفت کے باوجود کامیاب ہوئے اور معاشری اصلاح و ترقی کا کام کرنے والوں کے لیے قابلِ تقلید مثال قائم کر دی۔

ماہنامہ زندگی رامپور

- آپ کو آپ کی زندگی کا مقصد بتاتا ہے۔
- قرآن کی دعوت کو صحیح ترین انداز میں پیش کرتا ہے۔
- اسلام کی بنیادوں پر ہمہ گیر انقلاب کا علم بردار ہے۔
- وقت کے باطل نظریات پر مدلل تنقید کرتا ہے۔
- دُنیا کو حقیقی امن اور فلاح کا راستہ دکھاتا ہے۔
- سطحی لذتیت کے بجائے ٹھوس مذاق پیدا کرتا ہے۔
- اسلام کی روشنی میں مسلمانوں کے مسائل کا حل پیش کرتا ہے۔
- آپ کے فاضل اوقات کا بہترین ساتھی ہے۔

ہر مہینے ۶۴ صفحات کا قیمتی مجموعہ

اپنے مقام کی ایجنسی سے خریدیئے یا ہم کو براہِ راست لکھیے

مینیجر رسالہ زندگی۔ رامپور۔ یو۔پی

چندہ سالانہ پانچ روپے۔ ششماہی تین روپے۔ نمونہ پچاس پیسے